ایشیا جاگ اٹھا

سردار جعفری

یہ ایشیا کی حسین بستی ہے نینک کا راستا نہیں ہے
اڑیں گے جس میں تمہارے بمبار اب یہ ایسی ہوا نہیں ہے
تمہیں گذرنا پڑیگا ہر گام پر تلنگانے کی زمیں سے
تمہارے سر پر پہاڑ برسیں گے چھاپہ ماروں کی آستیں سے
بھنور کے حلقے تمہارے پیروں میں اپنی زنجیر ڈال دیں گے
ہواؤں کے ہاتھ تم کو نیلی فضا سے اوپر اچھال دیں گے

ایشیا جاگ اٹھا

طویل نظم
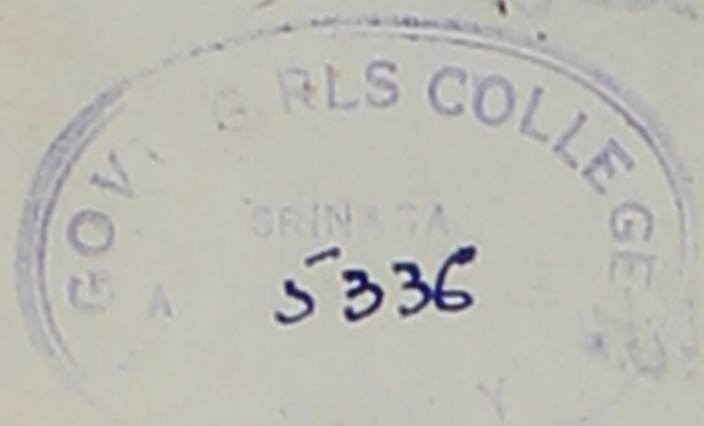
سردار جعفری

مکتبہ شاہراہ۔ دہلی

جون ۱۹۵۰ء سنٹرل جیل - ناسک

پہلی بار اکتوبر ۱۹۵۰ء

دوسری بار مارچ ۱۹۵۲ء

قیمت ۱۲ر

(نعمانی پریس - دہلی)

کرشن چندر کی حسین و جمیل

کہانیوں کے نام!

جو

ایشیا کی جنگ آزادی کے خوبصورت ہتھیار رہیں

جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اک حرفِ محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ
جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا، وہ عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

اقبالؔ

حرفِ اوّل

اب سے ہوگا ایشیا پر ایشیا والوں کا راج
دست محنت دے گا دستِ محنت سے خراج
زندگی بدلی ہے بدلا ہے زمانے کا مزاج
چھوڑ دیں گے ہم یہ آنکھیں ہم کو مت آنکھیں دکھاؤ
ایشیا سے بھاگ جاؤ

ہم نے دیکھے ہیں بہت ظلم و ستم قہر و عتاب
نوچ لیں گے ہم تمہاری سلطنت کا آفتاب
ہم بھی دیں گے تم کو اب جوتے سے جوتے کا جواب
ہاں بڑے آئے کہیں کے لاٹ صاحب جاؤ جاؤ
ایشیا سے بھاگ جاؤ

لد گئے وہ دن کہ جب آقا تھے تم اور ہم غلام
ہم وہ بے حس تھے کہ تم کو جھک کے کرتے تھے سلام

آج ہم ہیں بد دماغ و بد زبان و بد لگام!
سیر کا بدلہ ہے سیر اور پاؤ کا بدلہ ہے پاؤ
ایشیا سے بھاگ جاؤ

ہاں کبھی تھا ایشیا مجبور و محکوم و فقیر
دوسروں کا ذکر کیا خود اپنی نظروں میں حقیر
قبر کا مُردہ یہ جسمِ نوجوان و روحِ پیر
زخم خوردہ پیٹھ پر تاریک صدیوں کا دباؤ
ایشیا سے بھاگ جاؤ

ایشیا روحِ لطافت پیکرِ حُسن و جمال
دھان کے کھیتوں کا سینہ ڈھاک کے پھولوں کے گال
بجلیوں کے نرم و نازک ہاتھ طوفانوں کے بال
آہن و فولاد سے مضبوط شانوں کا گٹھاؤ
ایشیا سے بھاگ جاؤ

ماؤ، استالن کا بھائی، لینن اعظم کا لال
مٹھیوں میں تتلیوں کی طرح روحِ ماہ و سال
نرم آنکھوں میں محبت گرم ماتھے پر جلال
اُس کے کمیون ہار ہیں اور ایشیا والوں کی ناؤ
ایشیا سے بھاگ جاؤ

ڈالروں کے زور پر اس درجہ اتراتے ہو کیا
ہم کو اپنی توپ اپنے ٹینک دکھلاتے ہو کیا

ہائیڈروجن اور ایٹم بم سے دھمکاتے ہو گیا
ہم نہیں ڈرنے کے، جاکر اپنے بھوتوں کو ڈراؤ
ایشیا سے بھاگ جاؤ

یہ کمینے، ملک کے غدّار، ڈالر کے غلام
جن کے مُنھ میں تم نے ڈالی ہے حکومت کی لگام
یہ بغل بچے، یہ پٹھو بھی نہیں آئیں گے کام
یہ تو ہیں بھاڑے کے ٹٹوان پہ مت بازی لگاؤ
ایشیا سے بھاگ جاؤ

تیوریاں بدلے ہوئے ہیں اب زمین و آسماں
بجلیاں لے کر اُٹھا ہے دل کی آہوں کا دُھواں
آنکھ سے آنسو کے بدلے ڈھل رہی ہیں گولیاں
بن گئے ہیں رائفل کی آنکھ اب سینے کے گھاؤ
ایشیا سے بھاگ جاؤ

دیکھتی ہیں مُڑ کے صدیاں چین کی فوجوں کی شان
ہے ہمالہ کی بلندی پر بغاوت کی اُٹھان
ندّیوں کے دل پہ چھاپے مار قدموں کے نشان
دشمنوں کو گھیرے لیتا ہے پہاڑوں کا گھماؤ
ایشیا سے بھاگ جاؤ

ویت نامی فوج چلتی ہے کہ چلتے ہیں پہاڑ
موج سرکش ہے کہ اڑتے ہیں اُچھلتے ہیں پہاڑ

انقلابی جوش ہے جیسے پگھلتے ہیں پہاڑ
چوٹیوں پر آج روشن ہیں بغاوت کے الاؤ
ایشیا سے بھاگ جاؤ

جنگلوں سے حملہ آور ہیں ملایا کے دلیر
گونجتے ہیں بادلوں کی طرح سے برما کے شیر
ہند و پاکستان جاگ اُٹھے، نہیں ہے کوئی دیر
آمد آمد عدل کی، ظلم و ستم کا چل چلاؤ
ایشیا سے بھاگ جاؤ

خاکِ ایراں میں سلگتی ہیں دبی چنگاریاں
مصر و ترکی کی زمیں پر خون کی گلکاریاں
شام اور لبنان میں اُٹھنے کی ہیں تیاریاں
وقت کی تلوار کا خم ہے کہ ابرو کا کھنچاؤ
ایشیا سے بھاگ جاؤ

بُن رہے ہیں جال مِل کر آج تسبیح و جنیو
بچ کے جا سکتا نہیں دیسی بدیسی کوئی دیو
پڑ رہی ہے ہر قدم پر اک تلنگانے کی نیو
دھان اور گیہوں کے پودوں میں کمانوں کا جھکاؤ
ایشیا سے بھاگ جاؤ

آندھیوں کا زور ہے نعروں کی بوچھاروں کے ساتھ
نفرتوں کی بارشیں آنکھوں کے انگاروں کے ساتھ

موت اڑتی ہے تمہارے شاہی بمباروں کے ساتھ
اب نہیں ممکن تمہارے تاج و پرچم کا بچاؤ
ایشیا سے بھاگ جاؤ

آگ کا دریا ہے اب پورب کے سرچشموں کا تیل
بن گئی ہے آہنی زنجیر انگوروں کی بیل
شہ پہ شہ پڑتی ہے اب باقی کہاں ہے کوئی کھیل
پٹ چکے ہیں سارے مُہرے شاہ و فرزیں بھی اُٹھاؤ
ایشیا سے بھاگ جاؤ

تم کو کچے مال کے بدلے ملے گی ایک لات
بن گئے ہتھیار دہقانوں کے مزدوروں کے ہات
خاک کے سینے سے لاوا بن کے اب نکلے گی دھات
جان کی بازی ہے اب اس خاک کے ذرّوں کا بھاؤ
ایشیا سے بھاگ جاؤ

چل رہے ہیں وقت اور تاریخ کے کھیتوں میں ہل
پھل رہے ہیں پیڑ کی شاخوں میں تلواروں کے پھل
سانس لیتے ہی بگ اُٹھتے ہیں ہواؤں میں دُہل
الاماں بگڑی ہوئی سرکش فضاؤں کا تناؤ
ایشیا سے بھاگ جاؤ

ایشیا ناگنیوں کا جنگل ہے تمہارے واسطے
ساحلوں کی ریت بھوبل ہے تمہارے واسطے

خون سے لبریز چھاگل ہے تمہارے واسطے
بوند پانی بھی نہ دیں گے تم کو پانی کے پیاؤ

ایشیا سے بھاگ جاؤ

تم جہاں بھی پاؤں رکھو گے زمیں ہٹ جائے گی
ظلم کی گردن ہوا کی دھار سے کٹ جائے گی
یہ فضا اک بم کے گولے کی طرح پھٹ جائے گی
سلطنت کی فکر چھوڑو خیر جانوں کی مناؤ

ایشیا سے بھاگ جاؤ

ایشیا کی خاک پر دم توڑتا ہے سامراج
ایشیا کی ٹھوکروں میں ہے ملوکیت کا تاج
ایشیا میں ایشیا کا جشنِ آزادی ہے آج
ایشیا کے خون میں ہے صبح مشرق کا رچاؤ

ایشیا سے بھاگ جاؤ

ایشیا کی جنگِ آزادی ہے اک دُنیا کی جنگ
ہے ہمارے زخمِ دل میں سارے عالم کی اُمنگ
ہاں بدل جانے کو ہے اب مشرق و مغرب کا رنگ
آج سب مِل کر پکارو، مِل کے سب نعرے لگاؤ

"ایشیا سے بھاگ جاؤ"
"ایشیا سے بھاگ جاؤ"

(۱)

یہ ایشیا کی زمین، تمدن کی کوکھ، تہذیب کا وطن ہے
یہیں پہ سورج نے آنکھ کھولی
یہیں پہ انسانیت کی پہلی سحر نے رُخ سے نقاب اُلٹی
یہیں سے اگلے یُگوں کی شمعوں نے علم و حکمت کا نور پایا
اسی بلندی سے وید نے زمزمے سنائے
یہیں سے گوتم نے آدمی کی سمانتا کا سبق پڑھایا
یہیں سے مزدک نے عدل و انصاف اور محبت کے راگ چھیڑے
ہماری تاریخ کی ہوائیں مسیح کے بول سُن چکی ہیں
ہمارا سورج محمد مصطفٰے کے سر پر چمک چکا ہے
اور اب ہمارے قدیم آکاش کے ستارے
قدیم آنکھوں سے ماؤ کی سُرخ فوج کی شان دیکھتے ہیں

یہ خاک وہ خاک ہے کہ جس نے
سنہرے گیہوں کے موتیوں کو جنم دیا ہے
یہ خاک اتنی قدیم جتنی قدیم انساں کی داستانیں
عظیم اتنی عظیم جتنی ہمالیہ کی بلندیاں ہیں
حسین اتنی حسین جتنی حسیں اجنتا کی اپسرائیں
یہ اپنی فیاضیوں میں دریائے نیل و گنگا سے کم نہیں ہے۔

یہ گود بچوں سے اور پھولوں سے اور پھلوں سے بھری ہوئی ہے

حقیر کپلنگ مر چکا ہے
ذلیل چرچل کو شاید اب تک خبر نہیں ہے
ہمارے کھنڈروں کے نام بھی اُن کی ساری بکواس سے گراں ہیں
ہمارا ورثہ مہنجوداڑو سے لے کے دیوارِ چین تک ہے
ہماری تاریخ تاج اور سیکری سے اہرام مصر تک ہے
ہمیں روایات کے خزانوں سے بابل و نینوا ملے ہیں
فصاحتوں نے ہمارے بچپن کے ہونٹ چومے
بلاغتوں نے بڑی حسیں لوریاں سنائیں
زبان کھولی تو وید، انجیل اور قرآن بن کے بولے
ہماری تخئیل آسمانوں کی اس بلندی کو چھو چکی ہے
جہاں سے فردوسی اور سعدی
نظامی، خیام اور حافظ کے چاند سورج چمک رہے ہیں
بلندیاں جن پہ والمیک اور پاک تلسی
کبیر اور سور حکمراں ہیں
انہیں فضاؤں کی بجلیاں ہیں
جو ساز اقبال اور ٹیگور کے ترانوں میں گونجتی ہیں
جو آج ناظم کی شاعری میں تڑپ اٹھی ہیں
جو لوہ سوں کی کہانی بن کر چمک رہی ہیں

(۲)

گذر چکے ہیں ہمارے سر سے
ہزاروں سالوں کے تند طوفاں
مصیبتوں کی ہوائیں، ظلم و ستم کی آندھی
نہ جانے کتنے سکندروں کی وبائیں آئیں
ہزاروں چنگیز اور تیمور، ان گنت مانچو لٹیرے
کہیں سے راون، کہیں سے ضحاک اپنے بالوں میں سانپ گوندھے
کہیں سے ہسٹنگز اور کلایو
کہیں سے ڈائر کہیں سے ڈیول
کوئی سیہ فام کوئی بھورا کوئی سفید اور کوئی پیلا
غرض ہر اک رنگ روپ کے بھیڑیوں کے حملے
مگر یہ انمول خاک پھر بھی حسین پھر بھی جواں رہی ہے
ہمارے رستم ہمارے ارجن مرے نہیں ہیں
وہ جنگلوں اور پہاڑیوں میں زمین پر کاشت کر رہے ہیں
ہمارے فرہاد اب بھی تیشے چلا رہے ہیں
جوان لیلیٰ، حسین شیریں، کنواری ہیر اب بھی گا رہی ہے
شکنتلائیں گھنیرے پیڑوں کے سبز سایوں میں ناچتی ہیں
ہم ایشیا کے عوام سورج کی طرح ڈوبے ہیں اور ابھرے
دکھوں کی اگنی میں تپ کے نکھرے
ہماری آنکھوں کے آگے کتنی سیاہ صدیوں کی سانس ٹوٹی

نہ جانے کتنے بلند پرچم
ہماری نظروں کے سامنے سرنگوں ہوئے ہیں
اُلٹتے دیکھے ہیں تخت ہم نے
اُجڑتے دیکھے ہیں تاج ہم نے
ہمارے سینے سے جانے کتنی رتھوں کے پہیے گذر چکے ہیں
مگر ہم اس بھوک، قتل، افلاس کے اندھیرے
حوادثِ روزگار کے تُند و تیز شعلوں میں ان گنت جنم لے چکے ہیں
ہم اپنی دھرتی کی کوکھ میں بیج کی طرح دفن ہو گئے تھے
مگر نئی صبح کی ہوائیں
بہار کی کونپلوں میں تبدیل ہو کے باہر نکل پڑے ہیں

(۳)

ہماری نظروں میں اگلے وقتوں کے سورماؤں کے کارنامے
گئے یُگوں کے اُفق دُھندلکوں میں چھپ چکے ہیں
مگر پرانے دلاوروں کے پرانے چہرے
پرانے گرد و غبار میں جگمگا رہے ہیں
یہ بے دلی کیوں
جھجک یہ کیسی
چل اے بغاوت کے عزم اے انقلاب کے آہنی ارادے
اُٹھا دے اے ذوق و شوق تاریخ کے رُخِ آتشیں سے بڑھ کر
ہمارے بیتے ہوئے مہ و سال کی نقابیں

پڑی وہ ڈنکوں پہ چوٹ گونجیں وہ ڈھول کی دل نشیں صدائیں
ہزاروں تلواریں بجلیوں کی طرح سے چمکیں
ہوائیں جھنکاریں ناچ اُٹھیں
زمین کی کانپتی ہتھیلی پہ زلزلے، زلزلوں کی لہریں
وہ دیکھو الموط کی پہاڑی اُبھر رہی ہے
بلند چوٹی پہ ایک دھوبی
وہ المقنع کہ جس کی نظروں کی آگ کے سُرخ سُرخ بادل
فضائیں پھیلے، زمیں پہ برسے
اور اپنی بیتاب بجلیوں سے
دیارِ بغداد میں خلافت کی شان و شوکت کو پھونک ڈالا
عرب کے جاگیردارو بھاگو
تمہاری فوجوں کی چھاونی پر کسان لشکر جھپٹ پڑے ہیں
زمین اور آسمان شعلوں کے پیرہن میں لرز رہے ہیں

دیارِ خیبر
جہاں پٹھانوں کے غول حلقوں میں ناچتے ہیں
اور ان کے ڈھولک کی تھاپ اورنگ زیب کا دل ہلا رہی ہے
یہ آفریدی ہیں اور وہ مہمند اور وہ شنواریوں کا جرگہ
دفوں پہ "غیرت" کا لفظ دوشیزہ اُنگلیوں سے لکھا ہوا ہے
رباب کے تار "جنگ اور جنگ" کہہ رہے ہیں
غرور کر اے زمینِ خیبر

کہ تجھ کو خوشحال خاں خٹک سا عظیم شاعر عطا ہوا ہے
وہ جس کا ہر لفظ اک رجز ہے
زمانہ اورنگ زیب کو بھولتا چلا جا رہا ہے لیکن
وہ باغی شاعر، وہ رہنما، سورما سپاہی
ہر اک صدی میں اُٹھے گا خیبر کی وادیوں سے
نئی جوانی، نئی بہاروں، نئی تمنا کا ساز لے کر
جہاں کہیں دل کا درد ہوگا
جہاں کہیں غم کا سوز ہوگا
جہاں کہیں حق کی بات ہوگی
کسی بھی گوشے میں ایشیا کے
جہاں کہیں آدمی بغاوت کا نام لے گا
وہیں سے خوشحال خاں کی للکار گونج اٹھے گی اس کے نغمے برس پڑیں گے

سہادری[1] کے پہاڑ انگڑائی لے کے جاگے
زمیں کا نقارہ تیز گھوڑوں کی تیز ٹاپوں سے بج رہا ہے
پہاڑ کی چوٹیوں نے توپوں کا روپ دھارا
چٹانیں قلعوں کی شکل لے کر ابھر رہی ہیں
کسان سیلاب بن کے ابلے
پلٹ گئیں وقت کی ہوائیں
اُلٹ گئیں سلطنت کی چالیں

---

[1] "سہادری" جنوبی ہندوستان کے ان پہاڑوں کا نام ہے جنہیں مغربی گھاٹ کہتے ہیں۔

مغل شہنشاہیت کو مہاراشٹر کے شیروں نے نوچ ڈالا

کسان، سیلاب، زلزلے، شور، گیت، نعرے

بغاوتیں، انقلاب، شورش

غدر کا ہیجان، ٹائیپنگ کا ابال اور باکسر کا طوفاں

یہ سب دلیروں کے مورچے ہیں

جو تیس صدیوں سے لڑ رہے ہیں

یہ سر ہمیشہ کٹا گئے ہیں

یہ دل ہمیشہ لٹا گئے ہیں

یہ ہات گلتے رہے ہیں لوہے کی ہتھکڑی میں

یہ پیر سڑتے رہے ہیں زنداں کی بیڑیوں میں

زمیں امر ہے

ہوا امر ہے

امر ہے پانی

امر عوامی دلوں کی دھڑکن

جو آسماں کی کھلی فضاؤں کو ڈھونڈھتی ہے

عوام مرتے نہیں ہیں سو جاتے ہیں زمیں کی سنہری مٹی میں مُنہ چھپا کر

وہ اپنی ماں کی سنہری چھاتی سے سر لگا کر بہار کے خواب دیکھتے ہیں

زمین سے کونپلیں نکلتی ہیں اور آکاش سے ستارے

ہوا سے بادل، گرج سے بجلی

عوام کی راکھ سے بغاوت کی آگ، شعلوں سے زندگانی

سلام لو ایشیا کے نوخیز سرفروشوں کی ہمتوں کا

پرانے وقتوں کے سورماؤ
گئے یُگوں کے افق سے کیوں دیکھتے ہو ہم کو
ہم آخری جنگ لڑ رہے ہیں
تمہارے ہاتھوں میں ابتدا تھی
ہمارے ہاتھوں میں انتہا ہے
تمہارے ہاتھوں میں صرف تلوار تھی ہمارے
جوان ہاتھوں میں وقت و تاریخ کی عناں ہے
ہمیں تم اپنے جوان شانوں کا زور اپنی
عقابی آنکھوں کا نور دے دو
بلند ماتھے کی روشنی لے کے آؤ ــــ آؤ
کہ ہم کو معلوم ہے تم اب تک مرے نہیں ہو
کہ تم کبھی بھی نہیں مرو گے
کسان فوجوں کو اپنی الموط کی پہاڑی سے لے کے اترو
حجاز اور نجد کے خوش آواز ساربانوں کو ساتھ لاؤ
ہمارے لشکر میں آؤ تم اپنے زرد دریا کے ساحلوں سے
ہمارے لشکر میں آؤ کوہاٹ اور خیبر کی وادیوں سے
ہمارے لشکر میں آؤ میرٹھ کے اور دہلی کے مورچوں سے
سہادری کی چٹانیں اک بار پھر ترانوں سے گونج اُٹھیں
اور ایشیا کے پٹھاریوں کسمسا کے جاگیں
کہ سامراجی دلوں کے پتھر
لرز اٹھیں ان کی راجدھانی کے سارے ایوان کانپ جائیں

(۴)

یہ ایشیا کی زمیں، تمدن کی کوکھ، تہذیب کا وطن ہے
بڑھائیں اپنی دُکان پچھم کے سارے سوداگروں سے کہہ دو
ہمارے بازار میں لہو کا ذلیل بیوپار بند کر دیں
کہ ان کی توپوں کے اور مشینوں کے واسطے اب
یہاں سے ایندھن نہیں ملے گا
وہ دن گئے جب
یہاں تم آئے تھے اپنی ہستی کی کوڑھ لے کر
زباں پہ بائیبل تھی، ہاتھوں میں رائفل تھی
لبوں پہ میٹھی ہنسی، نگاہوں میں زہر، دل میں ہوس پرستی
شکاری کتوں کی طرح تم ایشیا کی بستی میں پھر رہے تھے
تمہاری رفتار جس طرح توپ کے دھماکے
تمہاری ہر سانس جیسے بارود اڑ رہی ہو
تمہاری پرچھائیاں وباؤں کی پیرہن تھیں
ہماری آنکھوں نے پھر یہ دیکھا
کہ بادلوں سے ہمارے آنسو برس رہے تھے
زمیں سے قحط، کھیت سے بھوک اُگ رہی تھی
زبان گونگی تھی، اُنگلیاں سُن تھیں، سانس بے کیف و بے ترنّم
ستار کے تار ہچکیوں میں اُلجھ گئے تھے

وہ دن گئے جب

تمہارے ہاتھوں میں رائفل تھی ہمارے ہاتھوں میں کچھ نہیں تھا
ہتھیلیوں پر فقط لکیروں کو گن رہے تھے
شمار کرتے تھے آنسوؤں کا
مگر غلامی نے سیکڑوں سال کی غلامی نے ہم کو لڑنا سکھا دیا ہے
ہمارے اشکوں کی بوندیں اب گولیوں میں تبدیل ہو گئی ہیں
تم اس پہ پھولے ہوئے ہو شاید
کہ چیانگ کی طرح چند بھاڑے کے بوڑھے ٹٹو
تمہاری رتھ میں جتے ہوئے ہیں
کچھ اندھی آنکھوں کے بیل اب بھی تمہارا کولھو چلا رہے ہیں
تمہاری جنگی مشین میں کچھ
گھسے ہوئے ٹوٹے پھوٹے پرزے لگے ہوئے ہیں
مگر یہ غدار کب تلک کام آسکیں گے
کہ ایشیا اپنی نیند کی کیفیت سے بیدار ہو چکا ہے
ہماری آنکھوں میں آگ ــــ تیور میں بجلیاں ہیں
ہمارے سینے میں درد ، ہونٹوں پہ گیت ، ہاتھوں میں رائفل ہے

(۵)

یہ کیا کہا؟ تم نے ہم کو تہذیب اور تمدّن کا نور بخشا؟
بجا ہے، سچ ہے
جو تم نہ ہوتے تو ہم نہ ہوتے
نہیں کوئی شک نہیں کہ تم نے زمین پر پٹریاں بچھائیں

یہ دوسری بات ہے کہ ان پٹریوں کے نیچے
ہماری لاشیں بچھی ہوئی تھیں
ہمارے ساحل پہ تم دخانی جہاز لائے
اور ان میں توپیں کھڑی ہوئی تھیں
ہمارے ساحل کے زخم اب بھی
لہو کے ہونٹوں سے درد اور ٹیس کی زباں سے
تمہاری "تہذیب" کے قصیدے سُنا رہے ہیں
جہاز جو تین سو برس سے
سمندروں پہ رواں دواں ہیں
ہمارے آنسو کروڑوں آنکھوں سے ان جہازوں کو دیکھتے ہیں
جو صبح کے نور سے نکل کر اندھیری راتوں میں چھپ رہے ہیں
وہ جن میں ہندوستان، برما،
ملایا، ایران، شام، لبنان، مصر، ترکی، یمن کی محنت لدی ہوئی ہے
الائچی، زعفران، انگور، کوئلہ، ٹین، تیل، چاول،
ربر، ستارے، کپاس اور چاندنی بھری ہے
ہمیں مشینوں سے اور ملوں سے گِلہ نہیں ہے
کہ جن پہ انسانیت کی عظمت کی سُرخ مہریں لگی ہوئی ہیں
گِلہ ہے تم سے
جنھوں نے انسان کی بنائی ہوئی مشینوں کو ڈائنوں میں بدل دیا ہے
گِلہ ہے اُن سے
جنھوں نے پہیوں میں ہڈیاں ایشیا کی پیسیں

اوران سے چاندی کے ڈھیر، سونے کے اونچے اونچے پہاڑ اٹھائے
بگلہ ہے ان بوڑھے سود خواروں سے، نفع بازوں کی سازشوں سے
جو سوت کے تار اور ریشم کی ڈھیریوں کو
بنگل کے اپنے بدن کی چربی بڑھا رہے ہیں
مگر یہاں، ہم
کسان، مزدور، موچی، دھوبی
کمہار، لوہار، اپنے جسموں پہ کھال پہنے ہوئے کھڑے ہیں
ہماری آنکھیں جلے ہوئے خواب ـــــ اور چہرے
اڑے ہوئے رنگ ہیں ـــــ دلوں میں
سنہری آشاؤں کی چتائیں بھڑک رہی ہیں

تمہاری "تہذیب" سڑ چکی ہے
تمہارا جھوٹا "تمدن" اپنے فریب میں دفن ہو گیا ہے
تمہاری "تہذیب" قتل و غارت کا ناچ کوڑوں کی راگنی ہے
تمہاری "تہذیب" بھوکے بچّوں کی مَوت ماؤں کی خودکشی ہے
تمہاری "تہذیب" دست کاروں کے خون آلود ہاتھ ٹوٹے ہوئے انگوٹھے
تمہاری "تہذیب" دھوپ میں سوکھتی ہوئی ہڈیوں کے پربت
تمہاری "تہذیب" قصر بکنگ کی جلی راکھ کا ہے غازہ
تمہاری "تہذیب" زہر و افیون کی تجارت
تمہاری "تہذیب" ایشیا کی زمیں پہ ننگی پڑی ہوئی ہے

(۶)

یہ ایشیا کی زمیں، تمدن کی کوکھ، تہذیب کا وطن ہے
جبیں پہ تاروں کا تاج، پیروں میں جھاگ کی جھانجھنوں کا نغمہ
زمین ـــــ صدیوں پرانا چہرہ
کسان ـــــ صدیوں پرانے ہاتھوں میں اپنے لکڑی کے ہل سنبھالے
غریب مزدور، جلتی آنکھیں
اُچاٹ نیندوں کی تلخ راتیں
تھکے ہوئے ہاتھ، بھاپ کا زور، گرم فولاد کی گرانی
جہاز، ملاح، گیت، طوفاں
کمہار، لوہار، چاک، برتن
گوالنیں دودھ میں نہائی
الاؤ کے گرد بوڑھے افسانہ گو، کہانی
جوان ماؤں کی گود میں ننھے ننھے بچّوں کے بھولے چہرے
لہکتے میدان، گائیں، بھینسیں
فضاؤں میں بانسری کا لہرا
ہری بھری کھیتیوں میں شیشے کی چوڑیاں کھنکھنا رہی ہیں
اُداس صحرا پیمبروں کی طرح سے خاموش اور گمبھیر
کھجور کے پیڑ بال کھولے
دفوں کی آواز ڈھلکوں کی گمک
سمندر کے قہقہے ناریل کے پیڑوں کی سرد آہیں۔

ستار کے تار سے برستے ہوئے ستارے
انار کے پھول، آم کا بور، سیب و بادام کے شگوفے
کوٹھار، کھلیان، کھاد کے ڈھیر، کنواری پگڈنڈیوں کی گردش
بلند بانسوں کے جھنڈ ہنستی دھنک کے نیچے
گھنیرے جنگل
پٹھار، میدان، ریگزاروں کے گرم سینے
گپھائیں جنّت کی طرح ٹھنڈی
سمندروں میں کنول کے پھولوں کی طرح رکھے ہوئے جزیرے
چمکتے مونگوں کی مسکراہٹ
وہ سیپیوں کی ہنسی، وہ سنتھال لڑکیوں کے چمکتے دانتوں کی طرح موتی
وہ مچھلیاں گوشت سے بھری کشتیاں جو جھلی
سفید چاندی میں تیرتی ہیں
وہ لمبی لمبی حسین ندیاں
جو اپنی موجوں سے ساحلوں کے لرزتے ہونٹوں کو چومتی ہیں
دلھن بنی وادیوں کی نازک کمر میں جھرنوں کے زم حلقے
پہاڑیوں کی ہتھیلیوں پہ دھرے ہوئے نیلگوں کٹورے
ستارے منہ دیکھتے ہیں جھیلوں کے آئینے میں
ہمالیہ کے گلے میں گنگا کی اور جمنا کی شوخ بانہیں
پہاڑ کی آندھیوں کے ماتھوں پہ برف کے نیلگوں دوپٹے
بلندیوں پر خفیف سا ارتعاش ہلکی سی راگنی کا
ہوا کے پیروں میں جیسے گھنگھرو بندھے ہوئے ہوں

کہیں فضاؤں میں برف کے پُھول اڑ رہے ہیں
کہیں جوالا مُکھی کے شعلے
جو اپنی زلفوں کو پگھلے لاوے کی کنگھیوں سے سنوارتے ہیں
ہواؤں کی انگلیاں چناروں کے سُرخ بالوں میں رینگتی ہیں

یہ ایشیا ہے، جوان، شاداب اور دھنوان ایشیا ہے
کہ جس کے نردھن غریب بچّوں کو بُھوک کے ناگ ڈس رہے ہیں
وہ ہونٹ جو ماں کے دُودھ کے بعد پھر نہ واقف ہوئے کبھی دُودھ کے مزے سے
زبانیں ایسی جنھوں نے چکھا نہیں ہے گیہوں کی روٹیوں کو
وہ پیٹھ جس نے سفید کپڑا چُھوا نہیں ہے
وہ انگلیاں جو کتاب سے مَس نہیں ہوئی ہیں
وہ پیر جو بُوٹ اور سلیپر کی شکل پہچانتے نہیں ہیں
وہ سر جو تکیوں کی نرم لذّت سے بے خبر ہیں
وہ پیٹ جو بھوک ہی کو بھوجن سمجھ رہے ہیں
یہ نادرِ روزگار انساں
تمھیں فقط ایشیا کی جنّت ہی میں ملیں گے
جو تین سو سال کے "تمدن" کے بعد بھی "جانور" رہے ہیں

کہاں ہو "تہذیب اور تمدن" کی روشنی لے کے آنے والو
تمہاری "تہذیب" کی نمائش ہے ایشیا میں
نظر اُٹھاؤ قریب آؤ

یہ کوڑھیوں کے ہجوم دیکھو
یہ دیکھو ہیضے کی قے، یہ طاعون کی ہے گلٹی
یہ جسم کے آبلے ہیں اس آتشک کی گرمی
جو ایشیا کو ملی ہے انعام سامراجی سپاہیوں سے
یہ پیٹھ دیکھو، یہ پیٹھ کتنی حسیں ہے جس پر
تمہارے کوڑوں کی بدّیاں ہیں
یہ پھانسیوں پر لٹکتی لاشیں
یہ جیل خانوں میں بند انساں
یہ دل جو ہیں گولیوں سے چھلنی
یہ آنکھ کی پُتلیاں جو خون اور پیپ کی طرح بہہ رہی ہیں
یہ چہرے کھنڈروں کی طرح ٹوٹے
یہ ہاتھ لکڑی کی طرح سُوکھے
یہ پیٹ مٹکوں کی طرح پھُولے
یہ مفلسی اور یہ جہالت کی رات، بے چاند بے ستارہ
یہ بھُوک، یہ بے بسی، یہ نفرت
یہ ہنستے پھوڑے
لٹکتے گھینگے
دہکتے ناسور، چیختے زخم، رینگتے جسم، جیسے کیڑے
تمہاری سرمایہ دار "تہذیب" کی کہانی سُنا رہے ہیں
بُلاؤ اپنے مُصوّروں اور بُت گروں کو
کہیں زمانے میں اس قدر دردناک چہرے نہیں ملیں گے

تمہاری شاہانہ یادگاروں سے ایشیا کا
ہر ایک کونا بھرا ہوا ہے
کہیں پہ محراب فتح باندھی
کہیں رعونت کی لاٹ اُٹھائی
کہیں پہ کانسے کے گھوڑے ڈھالے
کہیں پہ پتھر کے بُت بنائے
مگر یہ "تہذیب اور تمدن" کی یادگاریں کہیں نہیں ہیں
بُلاؤ اپنے مُصوّروں اور بُت گردوں کو
کہو کہ ان دردناک چہروں سے ایک اک میوزیم سجا دیں
تمہارے کارِ عظیم کو جاوداں بنا دیں

(۷)

زمین سونا اُگل رہی ہے
فضائیں چاندی لٹا رہی ہیں
ہواؤں میں ہُن برس رہا ہے
سمندر اپنی تڑپتی موجوں کے جال میں مچھلیاں لئے ہیں
زمیں کے سینے پہ پیڑ، پھل، پھول، ناج، گہرائیوں میں کانیں
سیاہ ہیرے، اسیہ خزانے
ہر ایک پتھر کی رگ میں دوڑا ہوا ہے لوہا
ہر اک پرت کوئلے سے پُر ہے
وہ تیل کے سر بہ مُہر چشمے

کہ جن میں پگھلے ہوئے ستارے بھرے ہوئے ہیں
سنہرے شہتوت کے درختوں پہ نرم ریشم کے ننھے کیڑے
چمکتے پیراہنوں دمکتے ہوئے دوپٹوں کے خواب پر خواب بن رہے ہیں
حسین پُر زور آبشاروں میں بجلیوں کی تڑپ نہاں ہے
ہر اک ندی اپنے جل کی شکتی سے بہہ رہی ہے
ملوں کے پہیّوں کی گردشیں، چرخیوں کے نغمے
دہکتے انجن کے سینے جو آندھیوں کے آگے تنے ہوئے ہیں
مگر ہمارے وطن کی دولت
ندی کے پانی کی طرح بہتی
کسی بھیانک سیہ سمندر میں جا رہی ہے
اُداس ہے ایشیا کا چہرہ
بدن ہے ننگا
سڑک پہ بچّوں کی ننھی ننھی
ہتھیلیاں ٹھیکروں کی صورت پڑی ہوئی ہیں
ہزاروں بیکار ہاتھ شانوں پہ جھولتے ہیں

یہ کیسی سفاک انگلیاں ہیں
جنھوں نے لوہے کے تیز ناخون[1] پہلوؤں میں گڑا دیئے ہیں
یہ انگلیاں جو ہمارے جسموں سے کھال بھی کھینچے لے رہی ہیں
یہ لمبی لمبی سفید نلیاں
سفید جونکیں

---

[1] عام طور سے لوگ "ناخن" کو ناخون بولتے ہیں

ہزاروں میلوں کے فاصلے سے
ہمارے جسموں سے خون دھرتی سے تیل کو چوسے لے رہی ہیں
زمین پر پائپوں کی صورت بچھی ہوئی ہیں
سمندروں میں پڑی ہوئی ہیں
ہوا میں تانبے کے تار بن کر کھنچی ہوئی ہیں
ہماری گردن پہ نیلے نیلے نشان دیکھو
یہ بوڑھے بنکوں کی اُنگلیاں ہیں
جو سامراجی انگوٹھیوں سے سجی ہوئی ہیں

(۸)

کہاں ہو اے ایشیا کے بیٹو
تمہاری ماں اور اس کی عصمت
فرانس، امریکہ اور برطانیہ کے چکلوں میں بک رہی ہے
تمہارے اپنے ہی گھر کے غدّار آج دلاّل بن گئے ہیں
وہ کون ہیں؟ ان کے نام کیا ہیں؟
وہ ملک و قوم و وطن کے غدار عہدِ حاضر کے میر جعفر
مَیں ان کمینوں کے گندے ناموں کی گندی فہرست کیوں گناؤں
کہ تم انہیں خوب جانتے ہو
میں ان کے ناپاک نام سے اپنے فن کی پاکیزگی کو ناپاک کیوں کروں گا
انھوں نے بھی ایشیا کی ٹھنڈی ہواؤں میں پرورش ہے پائی
ہمارے چشموں کا میٹھا پانی پیا ہے چُولھوں کی آگ تاپی

مگر یہ کُتے
خود اپنے گھر کے نمک سے، روٹی سے اور پانی سے منحرف ہیں
یہ سانپ ہیں سانپ ان کے مُنہ میں
ہماری گایوں کا دُودھ بِس بن کے رہ گیا ہے
یہ بھیڑیئے بستیوں میں پھرتے ہیں سوٹ اور وردیاں پہن کر
ذلیل اور بے حیا کہ جے چند و میر جعفر کو شرم آئے
حقیر اتنے کہ گندے گھورے بھی دیکھ کر ناک بھوں چڑھائیں
یہ ایشیا کے پرانے ناپاک دشمنوں سے ملے ہوئے ہیں

تمھیں خبر بھی ہے تم غلاموں کی طرح سے بیچے جا چکے ہو
تمہاری قیمت ہے چند ڈالر
تمھیں خبر بھی نہیں مگر تم
ہزار پہیئوں کی جنگی رتھ میں جُتے ہوئے ہو
تمہارا لوہا پگھل کے موت اور جنگ کا روپ ڈھالتا ہے
روئی کے گالوں سے کارتوسوں کے مُنہ بھرے ہیں
تمہارے گھر بے چراغ، اندھی ہے لو دیوں کی
مگر تمہارے شریف نیتا
شریف آقا
تمہاری دھرتی کا تیل لوہے کے ہاتھیوں کو پلا رہے ہیں
تمہارے مُنہ اور پیٹ گیہوں کی روٹیوں کو ترس رہے ہیں
مگر تمہارے سُنہرے گیہوں کا چاندی جیسا سفید آٹا

سیاہ بارود بن گیا ہے
ہواؤں کے گیت بم کے گولوں میں دب گئے ہیں
سمندروں کی حسین نیلائیوں پہ جنگی جہاز اپنی
سیاہ پرچھائیوں کی چادر بچھا رہے ہیں
نظر اُٹھاؤ
فضا میں شعلوں کا جال پھیلا ہوا ہے دیکھو
زبان کھولو
اور اپنے نیتاؤں، دیسی آقاؤں سے یہ پوچھو
اگر تم آزاد ہو تو پھر کیوں بندھے ہو لندن کے اصطبل میں؟
اگر تم آزاد ہو تو نیویارک اور پیرس کے گندے گھوروں پہ کیوں پڑے ہو؟
ہماری دھرتی پہ آخر امریکی اور انگریزی لشکروں کے پڑاؤ کیوں ہیں؟
یہ ایشیا کے عوام پر ظلم و جبر کیوں ہے؟
یہ جنگ کس کے خلاف ہے؟ کون لڑ رہا ہے؟
یہ سامراجی نگاہیں کس سمت اُٹھ رہی ہیں

اُدھر جدھر زندگی تھرکتی ہے نو بہاروں کے پیرہن میں
جہاں غلامی کا غم نہیں انکھڑیوں میں اشکوں کا نم نہیں ہے
جہاں پہ ظلم و ستم نہیں ہے
جہاں لڑائی کی کوئی تیاریاں نہیں ہیں
جہاں پہ بمباریاں نہیں ہیں
فقط ستارے ہیں چاندنی ہے

سرور ہے، رقص ہے، بہاریں ہیں، زندگی ہے
وہ سوویت یونین حسین وجمیل رنگوں کی مُسکراہٹ
جو سارے مشرق کو اپنے رنگیں دھنش کی آغوش میں لئے ہے
طویل مضبوط، جیسے لینن کا ہاتھ جو ایشیا کے سر پر دھرا ہوا ہے

وہ سوویت جس نے اپنے دامن سے ساری دُنیا کے اشک پونچھے
بلکتے ہونٹوں سسکتی آنکھوں کو مُسکرانے کا گُر سکھایا
وہ سوویت جس نے قتل و غارت گری کی رسمِ کُہن اٹھادی
نظامِ ظلم و ستم مٹا کر نجات کا راستہ دکھایا
بڑی محبّت کے ساتھ جوڑا کروڑوں ٹوٹے ہوئے دلوں کو
کروڑوں ٹوٹے ہوئے دلوں سے نئے جہاں کا محل اٹھایا
وہ جس نے محکومیت کی صدیوں پرانی زنجیر توڑ ڈالی
وہ جس نے اِک جنبشِ نظر میں بدل دی انسانیت کی کایا
جواں ہتھوڑوں کی ضرب کاری نے سونے چاندی کے تاج کُچلے
جھکا دیا بادشاہ زادوں کا سر، غلاموں کا سر اُٹھایا
وہ جس نے محنت کے ہاتھ کو اور روٹیوں کو وقار بخشا
وہ جس نے دستِ طلب کی مظلومیت کو حُسنِ طلب سکھایا
وہ جس نے شانہ جھنجھوڑ کر ایشیا کو بیدار کر دیا ہے
پُرانے مُردوں کے دل میں بھی زندگی کی تحریک کو جگایا
وہ سوویت جس نے مختلف نسل و رنگ قوموں کی یونین سے
نئی تمنا کا ساز چھیڑا، نئی محبت کا راگ گایا

ذلیل جنگوں کے مورچے ڈھا کے ساری انسانیت کی خاطر
وقارِ انساں کے روح و دل کا حسین تر مورچہ بنایا
وہ جس نے قابو میں کر کے دریاؤں اور ہواؤں کی سرکشی کو
اُجاڑ بے رنگیوں کو رنگِ بہار کا پیرہن پہنایا
اُٹھا لیا مُسکرا کے آکاش سے دھنک کا رباب رنگیں
فلک سے نیچے زمیں پہ جنت کے خوابِ رنگیں کو کھینچ لایا
جبیں پہ لینن کا سُرخ سورج، لبوں پہ استالنی تبسّم
وہ سوویت جس کے سر کے اوپر ہے روحِ امن داماں کا سایا

یہ وہ ستارہ ہے جس کی بیباک روشنی میں
ہم ایشیا کے عوام اپنی حسین منزل کو دیکھتے ہیں
جو آنکھ اس حُسن کو حقارت سے دیکھنے کے لئے اُٹھے گی
ہم اس کی نظروں کو چھین لیں گے
جو ہاتھ اس جگمگاتے تارے کو توڑنے کے لئے بڑھے گا
ہم اس کو شانوں سے کاٹ دیں گے
جو پیر اس سرزمیں کی جانب اکڑ اکڑ کر چلیں گے وہ پیر توڑ دیں گے
اگر کسی کی زبان اس کے خلاف اک لفظ بھی کہے گی
ہم ایسی کالی زبان گدّی سے کھینچ لیں گے
یہ سوویت یونین، محبت کی ناؤ، انسانیت کا لنگر
ہماری قوت، ہماری حکمت، ہمارا ساتھی، ہمارا رہبر

کہو کہ ہم نفع خوریوں کے لئے رگوں کا لہو نہ دیں گے

کہو کہ ہم زہر گھولنے کے لئے دلوں کے سُبو نہ دیں گے
کہو لڑائی کے راکھشس کو ہم اپنے بچوں کے سر نہ دیں گے
کہو کہ شعلوں کی ناگنوں کو ہم اپنے آباد گھر نہ دیں گے
کہو کہ یہ ایشیا کی بستی ہے ٹینک کا راستہ نہیں ہے
اُڑیں گے جس میں تمہارے بمبار اب یہ ایسی ہوا نہیں ہے
تمھیں گذرنا پڑے گا ہر گام پر تلنگانے کی زمیں سے
تمہارے سر پر پہاڑ برسیں گے چھاپہ ماروں کی آستیں سے
تمہاری راہوں کو چین اور ویت نام کے شیر روک لیں گے
تمہاری فوجوں کو کوریا کے عوام دوزخ میں جھونک دیں گے
بھنور کے حلقے تمہارے پیروں میں اپنی زنجیر ڈال دیں گے
ہواؤں کے ہاتھ تم کو نیلی فضا سے اوپر اُچھال دیں گے
ہم آج بیدار ہو چکے ہیں تمہیں ابھی تک خبر نہیں ہے ؟
یہ بم کے گولے اُگے ہوئے ہیں ہمارے کاندھوں پہ سر نہیں ہے
ڈرو ہماری دہکتی آنکھوں سے آگ کی جن میں ندیاں ہیں
ڈرو ہمارے تڑپتے ہاتھوں سے جن کی جنبش میں بجلیاں ہیں
ڈرو کہ ہم اک جہانِ نَو کی زمیں پہ تعمیر کر رہے ہیں
ڈرو کہ ہم خونِ دل سے خوابوں میں رنگِ تعبیر بھر رہے ہیں

(۹)

اُٹھو اُٹھو ایشیا کے بیٹو
پہاڑ کی چوٹیوں سے اُترو

زمیں کی گہرائیوں سے نکلو
ملوں کے پہیّوں کو چھوڑ کر اس سڑک پہ آؤ
جہاں میں اک سُرخ رنگ جھنڈے کے ٹھنڈے سائے میں گا رہا ہوں
ملوں کے بھونپو کو چیخنے دو
جہاز و انجن کی سیٹیاں بج رہی ہیں، بجنے بھی دو، کہ یہ وقتِ سرکشی ہے
جھپٹ پڑو وادیوں سے طوفاں کا زور بن کر
اُبل پڑو ندیوں سے سیلاب کی طرح، کشتیوں سے اُترو
سنو، سنو، میرے بھائی، ہاں تم
جو اپنے جالوں میں سیکڑوں سال سے سمندر کی مچھلیاں بھر کے لا رہے ہو
جو سیکڑوں سال سے اسی چاک پر اسی سُرخ سُرخ مٹی سے سُرخ برتن بنا رہے ہو
جو سیکڑوں سال سے انھیں برگدوں کے نیچے
تھکے تھکے بازوؤں سے آرا چلا رہے ہو
جو سیکڑوں سال سے اسی اک دُکاں میں بیٹھے
سنہرے لوہے سے ہل کی پھالیں بنا رہے ہو
میں تم کو آواز دے رہا ہوں
سفید دھوتی، سیاہ کوٹ اور سیاہ ٹوپی پہننے والے
مرے برادر، خفا نہ ہونا
میں پوچھتا ہوں تمہاری ٹوپی پہ مَیل کیوں ہے؟
تمہارا کوٹ اور تمہاری دھوتی پھٹی ہوئی ہے
مجھی سے شرما رہے ہو بھائی؟
جواب دو، میں تمہارا ہمدرد و آشنا ہوں

تمہاری حالت چھپی نہیں ہے
تمہاری بیٹی کے پاس اسکول کی کتابیں نہیں ہیں
بیوی کے ہاتھ میں چوڑیاں نہیں ہیں
پُرانے جوتے کی کیل تلوے میں چُبھ رہی ہے

مرے جواں سال دوست حیراں کیوں ہو؟ میں اجنبی نہیں ہوں
تمہارا ساتھی ہوں اب سے سو سال پہلے تم سے
میں چین و برما میں مل چکا ہوں
تمہارے ہاتھوں میں ایک بندوق جسم پر ایک خاکی وردی
کہ جس پہ گرد و غبار کی تہہ جمی ہوئی تھی
تمہاری وردی بدل چکی ہے
مگر مرے دوست اپنا دشمن ابھی وہی ہے
وہی پرانا ذلیل، خُرّانٹ، سامراجی
تم ایشیا کے سپوت ہو، نوجواں سپاہی
کسان ماؤں کے نونہالو
مَیں صِرف یہ کہہ رہا ہوں اپنی زمین کا احترام کرنا
وطن کی دولت، گھروں کے دروازوں کے محافظ
تم اپنی بہنوں کے خواب، بچّوں کی مُسکراہٹ کے پاسباں ہو

ارے یہ تم ہو؟
بتاؤ تم اب تلک کہاں تھے؟
میں تم کو ایک ایک ساحل ایک ایک پورٹ پر ڈھونڈھتا پھرا ہوں

میں تم سے شنگھائی میں ملا تھا
خبر نہیں کتنے سال گذرے
عدن کے ساحل پہ تم کھڑے تھے
تمہارا بندر سے مُنھ کا کپتان تم کو اکثر
خلاصی کہہ کر پکارتا تھا
پھر ایک دن تم نہ جانے کس بات پر یکایک گرج اُٹھے تھے
تم ایشیا کے طویل ساحل کی آبرو ہو
سمندروں پر نگاہ رکھنا
کہ دشمنوں کے جہاز اور ڈاکوؤں کے بیڑے
ہمارے ساحل کے آس پاس اب بھی تیرتے ہیں

مری بہن! ہاں میں تم کو پہچانتا ہوں آؤ
قریب آؤ
تمہارے ماتھے کا خون اب تک تھما نہیں ہے؟
تمہارے سینے پہ اب بھی سنگین کا نشاں ہے
مگر وہ سیسے کی گرم گولی
تمہارے پہلو کو چیر کر جو نکل گئی تھی
اُسے میں ایک ایک آدمی کو دکھا رہا ہوں
یہ دیکھو میں اس کو ہاتھ میں لے کے پوچھتا ہوں
یہ گولی کس ملک میں بنی ہے؟
کہاں سے آئی ہے؟
کون لایا؟

یہی ہے امداد جو ہمیں اپنے دوست مغرب کے سامراجی حرام خوروں
سے مل رہی ہے ؟

اُٹھو مری ماں تمہاری بیٹی مری نہیں ہے
وہ زخمی ہاتھوں میں سب سے آگے
جلوس میں ایک سُرخ جھنڈا لئے کھڑی ہے
اُٹھو مری ماں
تم اپنے سر کے سفید بالوں کی چاندنی سے
اندھیری راتوں میں نور بھر دو
وطن کے سینے کو جگمگا دو
تمہارے ہاتھوں کی جھرّیاں مسکرا رہی ہیں
مری شریف و غیور ماں اپنا مریمی ہاتھ اپنے بیٹوں کے سر پہ رکھ دو
ہم آخری جنگ لڑنے میداں میں جا رہے ہیں
تمہاری آنکھوں میں اشک ہاتھوں کی جھرّیاں مُسکرا رہی ہیں

(۱۰)

جہاں میں طوفان آرہا ہے
چہار اور شانسی کے غاروں سے اَن گنت آفتاب نکلے
بغاوتیں وادیوں سے نکلیں پہاڑ سے انقلاب نکلے
سپاہی بن بن کے زرد دریا کے پہلوؤں سے حباب نکلے
اور ان حبابوں کے تند طوفاں میں چین کشتی چلا رہا ہے

جہاں میں طوفان آرہا ہے

پُرانی صدیوں کو نوکِ سنگین پر اُٹھائے ہوئے ہیں دہقاں
دلوں سے بیتاب ہو کے باہر نکل پڑے ہیں دلوں کے ارماں
وہ فوج چلتی ہے جیسے آندھی، وہ جھنڈے اڑتے ہیں جیسے طوفاں
زمین کو زلزلوں کا مضبوط ہاتھ جھولا جھلا رہا ہے

جہاں میں طوفان آرہا ہے

سنہرے محلوں پہ گرم لوہا برس رہا ہے شرار بن کر
ہزار نقشِ قدم اُبھرتے ہیں لاکھ نقش و نگار بن کر
زمین اڑتی ہے آسماں کی بلندیوں پر غبار بن کر
غبار جو اڑ کے آج نیو یارک اور لندن پہ چھا رہا ہے

جہاں میں طوفان آرہا ہے

بہت بہت شکریہ ٹرومین و مارشل کی نوازشوں کا
نکل گیا چین میں دیوالہ ہی ڈین اچیسن کی سازشوں کا
یہی ہے انجام چیانگ جیسے حرام خوروں کی کاوشوں کا
کہ نامرادی کا ہاتھ ظالم و ہوس کی گردن دبا رہا ہے

جہاں میں طوفان آرہا ہے

کہاں ہو امریکی بدمعاشو، یہ چین کا انقلاب دیکھو
تمہارا مُنھ ایک ہی طمانچے میں پھر گیا ہے جواب دیکھو
وہ کس طرح مُسکرا رہے ہیں شہید روحوں کے خواب دیکھو
چمکتی کرنوں کی جوت پڑتی ہے ایشیا جگمگا رہا ہے

جہاں میں طوفان آرہا ہے

پکار کر چین کہہ رہا ہے کہ ایشیا کی نجات ہوں میں
بظاہر اک ملک ہوں حقیقت میں لیکن اک کائنات ہوں میں
جو ایستالن کے دل سے نکلی وہ ماؤ کے لب کی بات ہوں میں
بات جس کا حسیں فسانہ طویل ہوتا ہی جا رہا ہے
جہاں میں طوفان آرہا ہے

یہ وہ سیاست ہے جس نے خنجر کی نوک سے بیڑیوں کو کاٹا
یہ وہ فراست اٹک گیا سامراجیوں کے گلے میں کانٹا
یہ وہ سخاوت ہے جس نے کھیتوں کو روٹیوں کی طرح سے بانٹا
یہ ہے وہ داتا جو دونوں ہاتھوں سے اپنی دولت لٹا رہا ہے
جہاں میں طوفان آرہا ہے

اب آج پہلے پہل ہنسے ہیں غموں کے بیٹے دکھوں کے پالے
وہ اُنگلیاں کٹ گئیں حلق[1] سے نکال لیتی تھیں جو نوالے
پھلی کچھ اس طرح فصل ابکی کہ بھر گئے چاولوں کے پیالے
کسان کھیتوں میں ناج بوتا ہے اور مُوتی اگا رہا ہے
جہاں میں طوفان آرہا ہے

جو بند تھیں سامراجی روڑوں سے کھل گئیں آخرش وہ راہیں
لبوں سے بوسے اڑے عقیدت کے آنکھ سے پیار کی نگاہیں
حسیں سمرقند کے گلے کا ہیں ہار اب نانکن کی باہیں
بخارا بیتاب ہو کے پیکنگ کو گلے سے لگا رہا ہے
جہاں میں طوفان آرہا ہے

---

[1] "حلق" کو میں نے "خلق" کے وزن کے بجائے "فلک" کے وزن پر استعمال کیا ہے کیونکہ عام بول چال میں لوگ ل کو متحرک ہی بولتے ہیں اس لئے "حَلَق"

لچکتا ابروئے نگارِ چیں کا دلوں پہ جادو چلا رہا ہے
دہکتے رنگِ شفق کا پرچم لہو کی سُرخی بڑھا رہا ہے
بلند جودی کا ہاتھ فتح و ظفر کا رستہ دکھا رہا ہے
ہمالیہ پہ کھڑا ہے ماؤ اور ایشیا کو بُلا رہا ہے

جہاں میں طوفان آ رہا ہے
جہاں میں طوفان آ رہا ہے

(۱۱)

یہ شاعری نہیں ہے
رجز کی آواز، بادلوں کی گرج ہے، طوفان کی صدا ہے
کہ جس کو سُن کر
پہاڑ آتے ہیں سبز ماتھوں پہ برف کی کلغیاں لگائے
دھوئیں کے بالوں میں سُرخ شعلوں کے ہار گوندھے
سمندر آتے ہیں جھاگ کی جھانجھنیں بجاتے
ہوائیں آتی ہیں اپنے جھونکوں کی نیلگوں گوپھنیں گھماتی
گھٹائیں آتی ہیں بجلیوں پہ سوار ہو کر
پٹھار آتے ہیں اپنے کاندھوں پہ ندیوں کی کمند ڈالے
چٹانیں آتی ہیں اپنا گرزِ گراں سنبھالے
وہ جنگل آتے ہیں آندھیوں کے نشاں اڑاتے
وہ ریگزاروں کے غول اپنے دفوں پہ گاتے
ببول آتے ہیں اپنے کانٹوں کے ہاتھ اُٹھائے

درخت آتے ہیں پتیوں کی ہری ہری تالیاں بجاتے
مُنار آتے ہیں گنبدوں کے بلند ڈنکوں پہ چوٹ دیتے
زمین آتی ہے اپنی ڈھولک پہ تال دیتی
اُجالے آتے ہیں گرم سورج کی ڈھال اٹھائے
اندھیرے آتے ہیں سرد تاروں کے تیر جوڑے
وہ کھیت آتے ہیں اپنے پودوں کی فوج لے کر
وہ جھاڑ جھنکار اپنے سینے میں چھاپہ ماروں کے دل چھپائے
شہید آتے ہیں خوں کے ہونٹوں سے گیت گاتے
سیاسی قیدی شکستِ زنداں کے خواب لے کر
کسان کنیائیں جلتی آنکھوں میں جلتی دوزخ کے گرم شعلے
جوانیاں عارضوں کی سُرخی میں رنگ و بوئے گلاب گھولے
دھڑکتے سینے شفق کے آنچل میں حُسن کی بجلیاں چھپائے
ہتھیلیاں آتی ہیں حنا کے کنول جلائے
پیار آتے ہیں ہنستے ہونٹوں کے پھول لے کر
حسین مائیں بدن پہ فصلِ بہار کی کونپلیں سجائے
ہمکتے بچوں کی مٹھیاں تتلیاں دبائے
ستارے پلکوں سے نور کی کشتیوں کو کھیتے
کتابیں آتی ہیں گنگناتی
مکان آتے ہیں آہ بھرتے
کلرک آتے ہیں اپنی بغلوں میں کاغذی فائلیں دبائے
ہتھوڑے آتے ہیں جنگ بازوں کا دل ہلاتے

جہاز آتے ہیں راج ہنسوں کا رُوپ دھارے
وہ سگنل آتے ہیں اپنے مغرور سر اُٹھائے
وہ انجن آتے ہیں بھاپ کے قہقہے لگاتے
بوائلر آتے ہیں جہنّم پہ مُسکراتے
وہ پہیے آتے ہیں سامراجی حرام خوروں کا سر کچلتے
کھنکتی رنگین چوڑیاں جیسے کرشن کے چکر کو گھماتی
چمکتے ٹیکے بھوؤں کی ترچھی کمان اٹھائے
وہ آنکھیں آتی ہیں جن میں اپنے غموں کا کاجل لگا ہوا ہے
وہ ہونٹ آتے ہیں جن میں کیلیں ٹھکی ہوئی ہیں
وہ ہاتھ آتے ہیں جن کو دھویا گیا ہے شبنم کے آنسوؤں سے
وہ ہاتھ آتے ہیں جو ہلوں کو چلا رہے ہیں
وہ ہاتھ آتے ہیں جو مشینوں کو چھو رہے ہیں
وہ ہاتھ آتے ہیں جن میں جھنڈے اُگے ہوئے ہیں
وہ ہاتھ آتے ہیں جن پہ نظمیں لکھی ہوئی ہیں
وہ ہاتھ آتے ہیں جو کہانی سُنا رہے ہیں
وہ ہاتھ آتے ہیں جو ستارے بنا رہے ہیں
وہ ہاتھ جو بجلیوں کی گردن پکڑ رہے ہیں
جو سنگ و آہن سے اپنا پنجہ لڑا رہے ہیں
وہ ہاتھ جو ساریوں کو رنگوں کی ناؤ میں ڈبو دے رہے ہیں
وہ ہاتھ جو اپنی انگلیوں سے زمیں کی تقریر لکھ رہے ہیں

اب ایشیا کی زمیں پہ ہاتھوں کا ایک جنگل اُگا ہوا ہے

یہ سنگِ مرمر کی، سنگ اسود کی مٹھیاں ہیں
کنول کی کلیاں، کپاس کے پھول، بم کے اور ناریل کے گولے
کہاں ہے اے نو عروسِ صبحِ بہار آجا
ہماری بیتاب مٹھیوں میں
شفق کا سیندور
چاند تاروں کے پھول
کرنوں کی سُرخ افشاں بھری ہوئی ہے

(۱۳)

ہمارے ہاتھوں میں ہاتھ دو سویت کمیونزم کی بہارو
ہمارے ہاتھوں میں ہاتھ دو اے عوامی جمہوریت کے ہنستے ہوئے ستارو
ہمارے ہاتھوں میں ہاتھ دو یورپ اور امریکہ کے جواں بخت کامگارو
ہم ایک ہیں ایک ہو گئے ہیں
سیاہ، پیلے، سفید، بھورے
ہم ایک فصلِ بہار کے پھول ایک سورج کی روشنی ہیں
ہم ایک دنیا کے مختلف تار اک سمندر کے دل کی موجیں
الگ الگ پھر بھی ایک ہیں ایک ایک دھرتی کے رہنے والے
ہم ایک دھرتی کے بسنے والے ہیں ایک انسانیت کے قائل
نہ کوئی پورب ہے اور نہ پچھم
زمین سورج کا آئینہ لے کے ناچتی ہے
حیاتِ انساں کی جیت کے گیت گا رہی ہے۔

صفیں جما رہے ہیں ہم قدم بڑھا رہے ہیں ہم

یہ وقت، وقتِ سرکشی ہے سر اُٹھا رہے ہیں ہم
یہ صبح صبحِ انقلاب گیت گا رہے ہیں ہم
نشانِ فتح آسمان پر اُڑا رہے ہیں ہم

قدم بڑھا رہے ہیں ہم

قدم بڑھاؤ راستوں کے پیچ و خم میں کچھ نہیں
گراؤ بجلیاں اب آنسوؤں کے نم میں کچھ نہیں
بس اِک قدم کا فاصلہ ہے اِک قدم میں کچھ نہیں
یہ منزلِ حیاتِ نو ہے مسکرا رہے ہیں ہم

قدم بڑھا رہے ہیں ہم

ہمیں ہے فکر دامنوں کی اور نہ آستین کی
ہمارے ساتھ چل رہی ہیں گردشیں زمین کی
بدل گئیں ہمارے واسطے ہوائیں چین کی
ہوائے چین ایشیا میں اب چلا رہے ہیں ہم

قدم بڑھا رہے ہیں ہم

رواں دواں ہیں نوجواں بغاوتوں کی چھاؤں میں
ہمارے چھاپے مار شہر شہر گاؤں گاؤں میں
لگے ہوئے ہیں بجلیوں کے پر ہمارے پاؤں میں
ہر ایک گام پر قیامتیں اُٹھا رہے ہیں ہم

قدم بڑھا رہے ہیں ہم

گُذر رہے ہیں قافلے دیارِ صُبح و شام سے
پہاڑ اپنا سر جُھکا رہے ہیں احترام سے
دہل رہی ہے موت نوجیاتِ تیز گام سے
نقوشِ پا سے کتنے مورچے بنا رہے ہیں ہم
قدم بڑھا رہے ہیں ہم

کہیں ہوا کے تند راہوار پر سوار ہیں
کہیں گھٹا کی گھن گرج کہیں پہ آبشار ہیں
کہیں خزاں کا رُوپ ہیں کہیں رُخِ بہار ہیں
ہر ایک رنگ روپ میں فضا پہ چھا رہے ہیں ہم
قدم بڑھا رہے ہیں ہم

جیل میں رہ کے سردار نے اپنا اور سماجی حالات کا گہری نگاہ سے سماجی تنقیدی
تجزیہ کیا اور ایشیا کی خوبصورت سچائی ان پر موثر ہوئی اور انھوں نے اپنی طویل
نظم۔ ایشیا جاگ اٹھا۔ لکھی جو بیک وقت رزمیہ بھی ہے اور غنائیہ بھی جس میں
ایپک کی شالیت اور غنائی سندرتا ہے۔ اس نظم میں ایشیا کا سارا اجل روپ سمٹ کر
سما گیا ہے اس نظم میں چار ہزار سالہ تہذیب کی تصویر ہے۔ یہاں کی غریبی چیتھڑے
پہنے دکھائی دے رہی ہے۔ اسکے عوام کی بغاوت کا بے پناہ جذبہ قومی اور ملی
احساسات کو سموتا ہوا ایک طوفانی سندر میں تبدیل ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ
اس نظم سے ہماری اردو کی ترقی پسند شاعری اپنے سن بلوغ کو پہونچتی ہے
جوان ہو جاتی ہے۔ اور خود سردار کی شاعری افادیت اور وجدان کی ان
سربلندیوں کو چھو لیتی ہے جہاں سے عظمت کی سرحدیں شروع ہوتی ہیں۔

کرشن چندر

Title Printed at The Fine Press DELHI